© rasailojaraid.com

اسلامی تحریکات کی حمایت اور صنفی پہلو*

مارک ٹیسلر/ جولین ٹیس*

زیر نظر مقالہ ان عناصر کے تجزیے اور اس کے نتائج پر مبنی ہے جن کے ذریعے منظم اسلامی تحریکات کے لیے مصر، کویت اور فلسطین میں پائی جانے والی عوامی حمایت کے صنفی پہلو کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس تجزیے کی بنیاد رائے عامہ کا وہ سروے ہے جس میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی تھی کہ ان تینوں معاشروں میں مردوں اور خواتین کے درمیان پائے جانے والے طرز ہائے زندگی اور نظام ہائے حکومت کے اختلافات کے باوجود اسلامی تحریکات کس طرح آگے بڑھتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں عامتہ الناس اور خواتین کے مابین موجود رجحانات و میلانات کے اختلاف کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس جائزے میں اس روز افزوں تحریری مواد کا پس منظر بھی شامل ہے جو اسلامی تحریکوں کے حوالے سے وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہا ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق سروے کے بعض نتائج اس تحریری مواد سے ہم آہنگ ہیں جبکہ کچھ دوسرے کلی طور پر ان سے مختلف۔

تحریکات اسلامی کا آغاز

سیاسی اسلام پر موجود نگارشات میں ان بہت سے عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے جنھوں نے گذشتہ ربع صدی میں اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان عوامل کی درجہ بندی سیاسی، معاشی، معاشرتی و ثقافتی اور خارجی پہلوؤں سے کی جاسکتی ہے۔

سیاسی طور پر گذشتہ پچاس برسوں میں عرب شرق اوسط بہت سی تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے تجربے نے قوم پرستانہ تحریکوں کو جنم دیا جنھوں نے ۶۰-۱۹۵۰ء کے دوران تیزی سے معاشرے میں اثر و نفوذ حاصل کیا۔ جو ریاستیں ان تحریکوں کے زیر اثر وجود میں آئیں انھوں نے اپنے دائرہ اختیار میں تجدد پسندی اور صنعتی ترقی کے وہ ماڈل اپنائے جو مغربی خطوط پر استوار تھے۔ بیشتر نے اپنے سیاسی اور دستوری نظاموں میں لادینیت (Secularism) پر زور دیا بالخصوص ان شعبہ ہائے زندگی میں جن کا تعلق تعلیم، محنت اور خواتین کے امور سے تھا۔

---

*Mark Tessler and Jolene Tesse, The Muslim World, April 1996. (تلخیص: شفق ہاشمی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۶۷ء کی عرب - اسرائیل جنگ اور اس کے نتیجے میں ملوکیت پر مبنی قدیم نظام اور روایات کی شکست اور نئی یہودی ریاست کی بالادستی نے لادینی اور تجدد پسندانہ افکار کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ قوم پرست زعماء نے زمام اقتدار ہاتھوں میں لیتے ہی اپنے دعوؤں سے عوامی توقعات اور خواہشات کو خوب ابھارا۔ کم و بیش ایک عشرے تک ان کا انداز حکمرانی خاصا موثر رہا۔ مصر، تیونس، الجزائر، شام اور عراق جیسے ممالک نے تعلیم، صنعت، زراعت اور خواتین نے حقوق جیسے میدانوں میں خاطر خواہ ترقی کی۔

۱۹۶۰ء کے اواخر اور ۷۰ء کے اوائل میں ان قوم پرست حکومتوں کی خامیاں ان کار ہائے نمایاں کے مقابلے میں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ بیشتر حکومتیں یا تو بدعنوان تھیں یا مطلق العنان، یا دونوں۔ عام مرد و زن شدت سے مظلومی، محرومی اور بے و قعتی کے احساسات کا شکار تھے۔ جس کے نتیجے میں بقول ایک تجزیہ نگار "قوم پرستانہ نظام حریت (National liberation Model) پر مبنی طرز حکومت کے خلاف وسیع پیانے پر مایوسی پائی جاتی تھی"۔ جس کے نتیجے میں بالاخر اسلامی جماعتوں کو ابھرنے اور معاشرے میں جڑیں پکڑنے میں مدد ملی۔

قوم پرستانہ لادین عرب حکومتوں کی اقتصادی ناکامیاں اتنی ہی واضح تھیں جتنی کہ ان کی سیاسی محاذوں پر پسپائی۔ ابتدائی معاشی ترقی جلد ہی عام لوگوں کی توقعات کو پورا کرنے سے قاصر ہو گئی۔ بیروزگاری کے عفریت نے ۱۹۷۰ء تک خوفناک صورت اختیار کر لی تھی۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور آبادی کا نوجوان طبقہ، شدید احساس محرومی کا شکار تھا۔ غریب شہری طبقات اپنے اندر بے روزگار نوجوانوں کے غول سموئے ہوئے تھے، جن کی روزمرہ معمولات کا بڑا حصہ گلیوں کے کنارے یا قہوہ خانوں میں بے مصرف بسر ہوتا تھا۔ یہ بے روزگاروں کی ہی فوج ظفر موج تھی، جنھیں الجزائر میں آج بھی "گھر بیٹھ لڑکے" یا "دیوار گیر لڑکے" کہا جاتا ہے۔ مصر، شام اور مراکش میں نوجوانوں کا یہی جتھا تھا، جس نے ۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں حکومت مخالف مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

نجی شعبہ میں مکمل جمود کی بنیاد پر آزادی کے بعد زیور علم سے آراستہ ہونے والے نوجوانوں کی اکثریت روزگار حاصل کرنے سے محروم تھی۔ ملازمت کے لئے ان کا تمام تر انحصار حکومتی ذرائع پر تھا۔ اس کے نتیجے میں لازما" نوکر شاہی کے حجم میں اضافہ ہوتا چلا گیا جو اقتصادی لحاظ سے گرتی ہوئی معیشت پر مزید بوجھ ثابت ہوا۔ اسی طرح بہتر تعلیم سے آراستہ مرد و زن کی بے روزگاری یا کمتر درجے کے روزگار نے اسلامی تحریکات کے لیے افرادی قوت کا ایک اور وسیلہ بہم پہنچا دیا۔ مصر، تیونس اور دوسرے مقامات پر جلد ہی ان تحریکات نے ہائی اسکولوں اور جامعات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی جولا نگاہ بنالیا۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر تک مسلم جماعتوں نے اکثر جامعات اور تعلیمی اداروں میں بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کی جگہ لے لی تھی اور یہ ادارے رفتہ رفتہ اسلامی سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل ہوتے گئے۔

بیشتر عرب ریاستوں میں پائی جانے والی ان معاشی اور سیاسی ناہمواریوں کے نتیجے میں آخرکار ایک طرف غربت اور امارت کے الگ الگ جزیرے ابھر آئے تو دوسری جانب مقتدر اور مراعات یافتہ طبقات اور محروم و پسماندہ عوام کے درمیان وسیع تر ہوتی ہوئی خلیج نے ایک بڑی معاشرتی اور ثقافتی تبدیلی کو جنم دیا۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف وسیع پیمانے پر آبادی کے انتقال نے بے روزگاری اور محرومی کی شکار شہری آبادی میں ایک نئے ہلاکت زدہ عنصر کو مزید شامل کردیا۔ اس طرح شہروں میں محروم طبقات کے اس ارتکاز سے جو معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوئیں انہوں نے اسلامی تحریکات کے لیے پنپنے کا ایک اور موقع فراہم کردیا۔ ان تحریکوں نے ان پسماندہ طبقات کو مذہب کی مانوس اصطلاحات کی روشنی میں آگے بڑھنے کا جو پیغام دیا وہ ان کے لیے خاصا پرکشش تھا۔

اس موقع پر ریاستی مشینری نے بھی اپنی اسلامی اقدار سے وابستگی کو عوام الناس پر ثابت کرنے کے لیے جو اقدامات کیے انہوں نے اسلامی تحریکات کو بالواسطہ تقویت پہنچائی۔ ۷۰ء کی دہائی میں مصر اور بعض دوسرے عرب ممالک کے حکمرانوں نے بائیں بازو کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے مذہبی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کی اور جب بعد میں انہیں احساس ہوا کہ وہی جماعتیں اور تنظیمیں بائیں بازو سے بڑھ کر ان کی راہ کی ایک بڑی مزاحم قوت بن چکی ہیں تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی اور ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ان بڑی جماعتوں اور متحرک تنظیموں پر قابو پاسکیں۔

ان داخلی حقائق کے علاوہ خارجی عوامل نے بھی اسلامی تحریکات کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں پہلا عامل جون ۱۹۶۷ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ میں مصر و شام کی انقلابی حکومتوں کی شکست فاش تھی۔ اس شکست نے ۱۹۴۸ء کی اسرائیل کے ہاتھوں قدامت پسند عرب حکومتوں کی شکست سے بڑھ کر اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لیے ماحول کو سازگار بنانے میں مدد دی تب یہ بات سمجھنی اور سمجھانی نسبتاً" زیادہ آسان ہوگئی کہ مادی ترقی اور خوشحالی کے لیے دینی اور قدامت پرستانہ نظاموں کی جگہ اسلام کا عطا کردہ مقامی' سیاسی نظام زیادہ قابل عمل اور سود مند ہے۔ مسلم مفکرین نے اسلامی نظام حکومت کے خدوخال اجاگر کئے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی۔ انہوں نے شکست خوردہ عربوں کو یہ باور کرایا کہ اسلام ان کے لیے وہ کرسکتا ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی دوسرا نظام حکومت و سیاست نہیں کرسکتا اور اس طرح مسلمانوں کی صفوں میں ایک نیا نظم و ضبط' ولولہ اور قربانی کا جذبہ وجود میں آگیا۔

خارجی عوامل میں دوسرا عامل ۱۹۷۰ء کی دہائی میں سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک کی وسعت پذیر تیل کی آمدنی ہے۔ علاقے کی قدامت پرست حکومتوں نے اس آمدنی سے ایک خطیر رقم مذہب کے فروغ' مساجد اور اسلامی ثقافتی مراکز کی تعمیر وغیرہ پر صرف کی' جن سے اسلامی تحریکات کو بالواسطہ تقویت ملی۔

تیسرا خارجی عامل ۱۹۷۹ء کا ایران کا اسلامی انقلاب ہے جس نے اسلامی تحریکوں کو عالمی سطح پر زبردست حوصلہ عطا کیا۔ چھوٹی سی یہودی ریاست نے جس طرح ۱۹۶۷ء کی عرب ۔ اسرائیل جنگ میں اپنے سے کئی گنا بڑی عرب طاقت کو شکست سے دوچار کیا تھا' اسی طرح اسلام کے جھنڈے تلے ایرانی حزب اختلاف نے حکومت وقت کی عظیم فوجی قوت کو جسے مغرب کی پشت پناہی حاصل تھی پاش پاش کردیا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف علامتی طور پر اسلامی تحریکات کے حوصلے بلند ہوئے بلکہ ایران کی انقلابی قیادت نے برملا عالمی اسلامی تحریکوں کی معاونت کا اعلان کیا اور یہ عزم بھی ظاہر کیا کہ وہ اپنے انقلاب کو برآمد کریں گے۔

اسلامی تحریکات اور خواتین

خواتین کی ایک معتدبہ تعداد کی جانب سے اسلامی تحریکات کی حمایت کا جائزہ نہایت ضروری ہے۔ یہ حمایت بعض مغربی مبصرین کے لیے ایک چیستان سے کم نہیں۔ اس لیے کہ بیشتر کے نزدیک یہ تحریکیں خواتین کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی اختیارات کو محدود کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر فی الحقیقت زیرنظر جائزے کا جو نتیجہ سامنے آتا ہے اس کی رو سے اسلامی تحریکات کے لیے مرد و زن کی حمایت کا تناسب ان تینوں ممالک (مصر' کویت اور فلسطین) میں کم و بیش ایک جیسا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ مسلم خواتین اسلامی تحریکوں کو اپنی حمایت کا اہل سمجھتی ہیں اور انہیں یقین ہے کہ ان تحریکات سے انھیں وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کی انہوں نے ان سے توقعات وابستہ کی ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ تقریباً" تمام اسلامی جماعتیں آزادی نسواں کے معاصر تصورات و نظریات کی مخالفت کرتی ہیں۔ تقریباً" سبھی' خواتین اسلامی لباس کی حامی اور شادی کے بندھن سے باہر ہر قسم کے اختلاط مرد و زن کی شدت سے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک خواتین کا کردار بیوی اور ماں تک محدود رہنا چاہیے۔ ایک شادی شدہ خاتون گھر سے باہر کام کاج کے لیے صرف اسی صورت میں جاسکتی ہے جب ایسا کرنے سے اس کے بنیادی فرائض متاثر نہ ہوتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں اور وہ فرائض شوہر کی خدمت اور ایک مسلم نسل نو کی پرورش کی ذمہ داریوں پر مشتمل ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اخوان المسلمون جیسی مرکزی نوعیت کی بڑی اسلامی جماعتیں عورتوں کے حقوق و فرائض دونوں کی علمبردار ہیں۔ وہ خواتین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔ اخوان کے بانی حسن البنا نے خواتین کی عملی زندگی میں شرکت کی ضرورت سے اتفاق کیا اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں انہوں نے خواتین کے لیے کئی نجی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ یہی فکر اخوان کے حلقہ خواتین میں بھی کار فرما نظر آتی ہے، جنہوں نے "الاخوات المسلمات" کے نام سے تنظیم بنا کر اپنا الگ سیاسی تشخص قائم کیا ہے۔ الاخوات مصر، کویت اور دوسرے عرب اور مسلم ممالک کی جامعات میں بالخصوص متحرک ہیں۔

مغربی مبصرین کے تصور کے علی الرغم بیشتر اسلامی تحریکات خواتین کی سیاسی بیداری پر کامل یقین رکھتی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عادلانہ اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد صرف مردوں ہی کا فریضہ نہیں۔ اسلامی تحریکوں سے وابستہ خواتین کی اکثریت دیہی علاقوں سے نقل مکانی کر کے شہروں میں آباد ہونے والی ماؤں کی بیٹیاں ہیں۔ ان کی اکثریت نے روزگار کے وسائل ناپید ہونے کے باوجود گریجویشن کی سطح تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اسلامی تحریکوں نے انہیں ایک بہتر معاشرتی اور سیاسی نظام کے قیام کی راہ دکھائی ہے اور انہیں تحریک کی فعال کارکن بنایا ہے۔ اسلامی تحریکات سے وابستہ ان خواتین نے گھر کی چار دیواری سے باہر اپنی خود اختیاری اور تشخص کو بخوبی اجاگر کیا ہے اور اپنے خاندان اور معاشرے میں بتدریج وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ "ان کی مذہبی ساکھ کی بدولت ان کے والدین اور گھر کے مرد حضرات مردوں کے مقابلے میں ان کی رائے کو زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں"۔

"حجاب" کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ "غیر اسلامی خواتین جسے معاشرتی دباؤ کا عمل تصور کرتی ہیں، اسلام پسند خواتین کے نزدیک وہ ایک فریضہ ہے جو ان کے جداگانہ تشخص اور خود اختیاری کا اظہار بھی ہے۔ اس طرح یہ حجاب ان کی آزادی اور طاقت کا نشان بن جاتا ہے"۔

اس تجزیے کی رو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تحریکات کی حمایت میں مرد و زن کا تناسب تقریباً مساویانہ ہے۔ اس تجزیے سے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ دونوں صنفوں میں اس حمایت کے حوالے سے بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں جن میں عمر، تعلیم، معاشی اور معاشرتی حیثیتوں کی یکسانیت شامل ہے۔

اعداد و شمار اور تحقیقاتی مواد

زیر نظر مقالہ جن اعداد و شمار پر مبنی ہے وہ رائے عامہ کے ان جائزوں سے ماخوذ ہے، جنہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصر، کویت اور فلسطین میں ترتیب دیا گیا۔ مصر اور کویت میں رائے عامہ کے یہ جائزے ۱۹۸۸ء کے وسط میں انجام دیے گئے۔ امارات یونیورسٹی کے شعبہ پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر اور ابوظہبی کے حربی تحقیق و مطالعہ کے مرکز' کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جمال السویدی اس جائزے کے نگران تھے۔ دونوں ممالک میں ایک ہی سوالنامہ استعمال کیا گیا۔ فلسطین میں رائے عامہ کا یہ جائزہ اپریل ۱۹۹۴ء میں نابلس کے ادارے فلسطینی مطالعہ و جائزے کے مرکز' کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیل شیکاکی اور ڈاکٹر نادر سعید کی زیرنگرانی عمل میں آیا۔ مصر اور کویت میں جواب دہندوں میں سنی مسلمانوں کے علاوہ مصر کے عیسائی اور کویت کے شیعہ بھی شامل تھے، جبکہ فلسطین میں یہ جائزہ دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں آباد مسلمانوں اور عیسائیوں کی آراء پر مشتمل ہے۔ ان جائزوں میں جو بات نمایاں ہے وہ یہ کہ مصر اپنی آبادی کی خصوصیات اور عمومی صورتحال کے لحاظ سے تیونس، الجزائر، اردن اور مراکش کے مماثل ہے، جبکہ کویت کی آبادی کی صورتحال تمام دوسری خلیجی ریاستوں سے ملتی جلتی ہے۔ فلسطینی ایک بے ریاست قوم ہونے کے ناطے دوسری عرب برادری سے قدرے مختلف ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ان دونوں جائزوں سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اسلامی تحریکات کی حمایت کا تناسب ہر جگہ مرد و زن دونوں میں کم و بیش ایک جیسا ہے۔

حاصل کلام

مذکورہ صدر جائزوں کی روشنی میں جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ خواتین اسلامی تحریکات کی حمایت میں مردوں سے کسی درجہ پیچھے نہیں اور یہ صورتحال ان تینوں ممالک میں تقریباً" یکساں ہے، جہاں یہ جائزے کئے گئے۔ دوسری بات یہ کہ وہ خواتین جو اسلامی تحریکات کی حمایتی ہیں ان کا تعلق اپنے اپنے معاشروں کے مختلف طبقات سے ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں اور رجحانات کے لحاظ سے متنوع پس منظر کی حامل ہیں۔ تیسری بات جو ان جائزوں میں سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کویت میں خواتین کو وہ سیاسی حقوق حاصل نہیں جو ان کے مردوں کو حاصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سیاسی تصور کی حمایت میں وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ متحرک نظر آتی ہیں، غالباً" اس لیے کہ وہ اپنے قانونی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

چوتھا اور آخری نکتہ جو ان جائزوں سے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ سیاسی اسلام کی حمایت کا تعلق معاشرے میں خواتین کی حیثیت کے حوالے سے پائے جانے والے رجحانات سے نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی تنظیمات کی حمایت صرف انہی حلقوں تک محدود نہیں جن کا خواتین کے معاشرے میں مقام کے حوالے سے رویہ قدامت پرستانہ ہے۔

© rasailojaraid.com